بھرپور جوابی کارروائی کی۔ اس بزدلانہ حملے پر فخر کرتے ہوئے لفٹیننٹ جنرل رنبیر سنگھ نے دعویٰ کیا کہ بھارتی فوج نے لائن آف کنٹرول کے پار دراندازی کے لیے جمع ہونے والے مسلح شدت پسندوں کے خلاف کامیاب سرجیکل سٹرائیکس کی، جس میں متعدد شدت پسند مارے گئے۔

پاکستان نے جنگی جنون میں مبتلا بھارتی حکومت کے جھوٹ، دوطرفہ معاہدوں اور بین الاقوامی قوانین کی سنگین خلاف ورزی کے خلاف بھارتی سفارت خانے اور اقوام متحدہ میں پرزور احتجاج کیا۔

بھارتی فوج کی طرف سے لائن آف کنٹرول کے پار بلا اشتعال فائرنگ کا سلسلہ جاری ہے۔

اب بھارت ''سندھ طاس معاہدے'' کو بھی توڑنے پر غور کرنے کا دعویٰ کر رہا ہے، جو 19 ستمبر 1960ء کو صدر ایوب خان اور جواہر لال نہرو کے درمیان طے پایا تھا۔ اس کے مطابق دریائے راوی، بیاس اور ستلج' بھارت کو اور دریائے سندھ، جہلم اور چناب' پاکستان کو ملا تھا۔

ظاہر ہے کہ بھارت جنگ ہی برپا کرنا چاہتا ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ یہ جنگ کشمیر پر ہوگی یا پانی پر!!

پاکستان کے شہ رگ پر بھارتی مظالم، لائن آف کنٹرول کی مسلسل خلاف ورزیوں اور سرجیکل سٹرائیکس کے جھوٹے دعوئی کے خلاف پاکستان کی تمام دینی، سیاسی اور سماجی جماعتیں متحد و متفق ہوگئی ہیں۔ اور پاک فوج اپنی تمام پیشہ ورانہ اور فنی صلاحیتوں کے ساتھ دفاعِ وطن کے لیے پوری طرح تیار ہے۔

اسلامی جمہوریہ پاکستان دو ایٹمی ملکوں کے درمیان مسلح جنگ کو بالکل پسند نہیں کرتا، اس لیے بھارت کو باہمی مسائل خلوص کے ساتھ سیاسی سطح پر حل کرنے کا مشورہ دیتا ہے۔

اس امن پسندی کو بھارت کی جنونی حکومت کمزوری خیال کر رہی ہے۔ ہم پھر بھی امن سے رہنا چاہتے ہیں اور جنگ میں مبتلا ہونا بالکل پسند نہیں کرتے۔ لیکن بھارت کو اپنے فوجوں کی کثرتِ تعداد اور اقوام عالم کی بے حسی کا غرور چین سے رہنے نہیں دیتا۔

انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ جنگیں نہ فوجوں کی کثرت سے جیتی جاتی ہیں نہ اسلحہ کے ڈھیروں سے۔ میدان جنگ میں پرخلوص جذبہ حریت کا عزم صمیم ہی لڑتا ہے۔ دشمن کو یاد رکھنا چاہیے کہ ہمارا بم تو دنیا جہاں سے گائے کے پجاریوں کو نیست و نابود کرنے کی صلاحیت کا حامل ہے۔

درس قرآن مجید

تراشِ رحمانی در فوائد قرآنی

ڈاکٹر اسماعیل محمد امین

قال تعالیٰ: ﴿وَاِذْ قَالَ مُوْسٰی لِقَوْمِہٖٓ اِنَّ اللّٰہَ یَاْمُرُکُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَۃً قَالُوْٓا
اَتَتَّخِذُنَا ھُزُوًا قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا
رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ قَالَ اِنَّہٗ یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِکْرٌ عَوَانٌ بَیْنَ
ذٰلِکَ فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُھَا قَالَ اِنَّہٗ
یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُھَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ ○ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ
یُبَیِّنْ لَّنَا مَا ھِیَ اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَہَ عَلَیْنَا وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰہُ لَمُھْتَدُوْنَ ○ قَالَ اِنَّہٗ
یَقُوْلُ اِنَّھَا بَقَرَۃٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِیْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِی الْحَرْثَ مُسَلَّمَۃٌ لَّا شِیَۃَ فِیْھَا
قَالُوا الْئٰنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ فَذَبَحُوْھَا وَمَا کَادُوْا یَفْعَلُوْنَ ○ وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا
فَادّٰرَءْتُمْ فِیْھَا وَاللّٰہُ مُخْرِجٌ مَّا کُنْتُمْ تَکْتُمُوْنَ ○ فَقُلْنَا اضْرِبُوْہُ بِبَعْضِھَا
کَذٰلِکَ یُحْیِ اللّٰہُ الْمَوْتٰی وَیُرِیْکُمْ اٰیٰتِہٖ لَعَلَّکُمْ تَعْقِلُوْنَ ○﴾ [البقرۃ ۶۷-۷۳]

''اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا: بیشک اللہ تعالیٰ تمہیں حکم فرماتا ہے کہ ایک گائے ذبح کرو۔ انہوں نے کہا: کیا تو ہمیں مذاق بناتا ہے؟ آپ نے فرمایا: میں اللہ تعالیٰ کی پناہ چاہتا ہوں کہ جاہلوں میں سے ہو جاؤں۔ انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کریں وہ ہمارے لیے واضح کرے وہ (گائے) کیا ہے؟ آپ نے فرمایا: بیشک وہ فرماتا ہے بیشک وہ ایسی گائے ہے جو نہ بوڑھی ہے اور نہ بچھڑی، ان کے درمیان جوان عمر کی ہے؛ پس تم کرو جو تمہیں حکم دیا جاتا ہے۔ انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے وہ ہمارے لیے واضح کرے اس کا رنگ کیا ہے؟ کہا: بیشک وہ فرماتا ہے بلاشبہ وہ گائے زرد رنگ

کی ہے، اس کا رنگ خوب گہرا ہے، دیکھنے والوں کو خوش کرتی ہے۔ انہوں نے کہا: ہمارے لیے اپنے رب سے دعا کیجیے وہ ہمارے لیے واضح کرے وہ (گائے) کیا ہے؟ بیشک گائیں ہم پر ایک دوسری کے مشابہ ہوگئی ہیں اور یقیناً اگر اللہ نے چاہا تو ہم ضرور ہدایت والے ہو جائیں گے۔ کہا: بیشک وہ فرماتا ہے وہ ایسی گائے ہے جو کام کرنے والی نہ ہے کہ زمین میں ہل چلائے اور نہ کھیتی کو پانی دیتی ہے، وہ صحیح سالم ہے اس میں کوئی داغ نہیں۔ انہوں نے کہا: اب آپ حق والی بات لے کر آئے ہیں، پس انہوں نے اسے ذبح کیا اور وہ قریب نہ تھے کہ یہ کام کر لیتے۔ اور جب تم لوگوں نے ایک شخص کو قتل کر دیا، پھر اس کے بارے میں جھگڑا کیا اور اللہ تعالیٰ اس بات کو نکالنے والا ہے جو تم چھپا رہے تھے۔ پس ہم نے فرمایا: اس پر اس کا کوئی ٹکڑا مارو، اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ فرماتا ہے اور تمہیں اپنی نشانیاں دکھاتا ہے، تاکہ تم سمجھ لو۔"

سابقہ آیتوں سے ربط اور مختصر تفسیر:

بنی اسرائیل کا انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام کے ساتھ کیے ہوئے عہد و پیمان کو توڑنے اور ان کی بری عادتوں کے بیان کا سلسلہ جاری ہے۔ بنی اسرائیل کی گائے کے قصے کی وجہ سے اس سورت کا نام سورۃ البقرۃ ہے۔

اس قصے کے پس منظر کے حوالے سے ائمہ مفسرین و حضرات تابعین عبیدۃ السلمانیؒ، ابو العالیۃ، السدیؒ وغیرہ سے مختلف روایات منقول ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے انہیں نقل کرنے کے بعد کہا: "بظاہر یہ ساری باتیں اسرائیلی روایات سے مأخوذ ہیں، جن کو معلومات کے لیے نقل کرنے میں حرج نہیں۔ لیکن ان کی تصدیق اور تکذیب نہیں کی جا سکتی۔ ان میں سے صرف انہی باتوں پر اعتماد کیا جائے گا جو ہماری شریعت کے موافق ہو۔"

روایات کا خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک مالدار آدمی کا وارث صرف ایک بھتیجا تھا۔ بعض روایات کے مطابق اس کی ایک بیٹی بھی تھی، یہ بھتیجا اس سے شادی کا خواہشمند تھا۔ چچا نے اس سے شادی کرانے سے انکار کیا، اس پر بھتیجے نے چچا کو قتل کر کے لاش دوسرے قبیلے والوں کے گھروں کے سامنے رکھ دی۔ پھر ان قبیلہ والوں پر قتل کی تہمت لگا دی، تاکہ اس کی دیت کا مال کھائے، اس کا وارث بھی بنے اور اس کی بیٹی سے شادی بھی کر سکے۔

بعض روایات کے مطابق اس کے کئی بھتیجے تھے۔ انہوں نے اپنے چچا کو اس کے مال کی وجہ سے قتل کیا، پھر انہوں نے دوسرے قبیلے پر قتل کی تہمت لگائی۔ ان کے درمیان سخت اختلاف ہوا اور وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فیصلہ کرانے کے لیے جمع ہو گئے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں مذکورہ فرمانِ الٰہی سنایا۔

﴿واذ قال موسیٰ لقومه﴾ دورِ نبوت کے یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے فرمایا۔ یہاں قوم کی نسبت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کی گئی ہے، جس میں اشارہ ہے کہ وہ انہیں صرف خیر کی طرف ہی رہنمائی کرے گا۔ کیونکہ انسان سب سے زیادہ اپنی قوم کے لیے خیر خواہ ہوتا ہے۔

﴿اِنّ اللّٰہ یأمرُکم اَن تذبحوا بقرۃً﴾ ان آیات میں تقدیم وتأخیر واقع ہوئی ہے۔ دراصل قصہ کا آغاز آیت ۷۲ ﴿وَاِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيْهَا﴾ سے ہوتا ہے۔ یعنی "جب تم لوگوں نے ایک شخص کو قتل کیا، پھر آپس میں جھگڑنا شروع کیا، تو اللہ تعالیٰ نے (قاتل کی نشاندہی کے لیے) تمہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔

یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے محض یہ نہیں فرمایا کہ ایک گائے ذبح کرو۔ بلکہ تاکیدی اسلوب میں فرمانِ الٰہی بیان فرمایا: ﴿اِن اللّٰہَ یأمرُکمْ اَنْ تذبحُوا بقرۃً﴾ تاکہ ان کے دل متأثر ہوں اور وہ فوراً اسے قبول کریں۔

﴿اَنْ تَذبحوا﴾ ذبح رگوں کو کاٹنے کو کہا جاتا ہے۔

﴿بقرۃً﴾ اصل میں بَقَرَ بَطْنَہٗ (اس نے پیٹ کو چیرا۔) گائے کو بقرۃ اس لیے کہا جاتا ہے کہ اس سے زمین کو چیرنے کا کام لیا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک بقرۃ گائے کو کہا جاتا ہے، اس کی تاء تأنیث کے لیے ہے۔ اور اس کے نر (بیل) کو "ثور" کہتے ہیں۔ اور بعض مفسرین کے نزدیک بقرۃ کی تاء وحدت کے لیے آئی ہے۔ اور بَقَرٌ جنس ہے۔ جیسے تمرٌ اور نملٌ جنس ہیں، اور تمرۃٌ، نملۃٌ سے مراد ایک کھجور اور ایک چیونٹی ہے۔

جب یہ تائے تأنیث نہیں ہے، تو بقرۃٌ سے مراد بیل بھی ہوسکتا ہے، جیسا کہ ہل چلانا اور رہٹ سے پانی کھینچنا بیل کی صفات ہیں۔ ممکن ہے انہیں بیل ذبح کرنے کا حکم دیا گیا ہو۔ اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ مصر میں کھیتی باڑی کا کام بیل کے علاوہ گائے سے بھی لیا جاتا ہو۔ واللّٰہُ أعلمُ

بقرۃٌ کی تنوین سے ظاہر ہے کہ یہ عام تھی۔ یعنی وہ کوئی بھی گائے ذبح کرتے تو کافی تھا۔ مگر انہوں نے پے در پے سوالات کیے؛ تاکہ کسی طرح اس حکم کی تعمیل سے جان چھوٹ جائے۔ مگر جتنے سوال کیے، حکمت الٰہی سے

پھنستے گئے، اور ان پر مزید سختیاں آتی گئیں۔

﴿أَ تتخذنا هُزُوًا﴾ میں ہمزہ استفہام ہے۔ هزوًا مصدر ہے، لیکن معنی کے لحاظ سے یہ اسم مفعول ہے۔ یعنی أتتخذنا مهزوًا بنا یعنی کیا آپ ہمیں اس طرح بنا رہے ہیں جن سے مذاق کیا جاتا ہے۔ یا معنی کے لحاظ سے بھی مصدر ہے۔ ھزوٌ کھیل، مذاق اور ٹھٹھا کو کہا جاتا ہے۔

﴿أَ تتخذنا هُزُوًا﴾ میں أتستهزئ بنا سے زیادہ مبالغہ ہے؛ کیونکہ پہلے جملے کا معنی ہے: کیا تو ہمیں مذاق کا محل سمجھ رہے ہو؟ جبکہ دوسرا جملہ ان سے مذاق سرزد ہونے پر دلالت کرتا ہے، اگرچہ ایک دفعہ ہی کیوں نہ ہو۔

جب بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس قاتل کی نشاندہی کا مطالبہ کیا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے انہیں ایک گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اس پر انہوں نے تعجب سے کہا: کیا تو ہمارے ساتھ مذاق کر رہا ہے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا: ﴿اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجَاهِلِيْنَ﴾ "میں جاہلوں میں شامل ہونے سے اللہ پاک کی پناہ چاہتا ہوں۔" چونکہ انبیاء کرام اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ وہ ہر معاملے میں اور خصوصاً اللہ تعالیٰ کی شریعت پہنچانے میں انتہائی امانت دار ہوتے ہیں۔ اور لوگوں کے بھی بڑے خیر خواہ ہوتے ہیں۔ تو ان کی طرف مذاق کی نسبت انتہائی توہین آمیز بات ہے۔

﴿الجاهلين﴾ جهل علم کی ضد ہے۔ یہاں اس سے مراد نادانی اور بے وقوفی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شریعت سے متعلق انبیاء کرام سے جو سوال ہو، وہ انہیں بالکل درست جواب دیتے ہیں۔ اگر ان کے جواب میں مذاق شامل ہو جائے تو یہ انتہائی جہالت اور نادانی ہوگی۔ بے فائدہ بات کرنا تو کسی بھی عاقل شخص کی صفت نہیں۔

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّن لَّنَا مَاهِيَ﴾ جب بنی اسرائیل کو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا یہ حکم قطعی اور برحق تھا، تو وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اس گائے کے بارے میں مختلف سوالات کرنے لگے۔ اور اللہ پاک نے اپنے نبی علیہ السلام کے ذریعے ان کے ہر سوال کا جواب نازل فرمایا، جس سے ان پر سختیاں اور پابندیاں آئیں۔

﴿قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ عَوَانٌ بَيْنَ ذٰلِكَ﴾ فَارِضٌ یہ بَقَرَةٌ کی صفت ہونے کی وجہ سے مرفوع ہے، یا یہ مبتدا محذوف (هي) کی خبر ہے۔ فارضٌ لغت میں وسعت والا ہے۔ عمر رسیدہ جانور کو وسعتِ عمر کی نسبت سے یا مادہ جانور ہونے کی صورت میں زیادہ بچے جننے سے پیٹ بڑا ہونے کی وجہ سے فارض کہا جاتا ہے۔

اسی طرح پرانی چیز کو بھی فارض کہتے ہیں۔ بِکْرٌ اصل میں ہر چیز کے ابتدائی حصے کو کہا جاتا ہے۔ اسی سے دن کے پہلے حصے کو باکرۃ یا بُکرَۃ کہا جاتا ہے۔ موسم کے پہلے میوے کو الباکورۃ کہتے ہیں۔ کنواری عورت کو بِکْر، باکِرَۃٌ اور اولاد میں سے پہلے کو بھی بِکْرٌ کہا جاتا ہے۔

﴿عَوَانٌ بَیْنَ ذٰلِکَ﴾ انسان اور جانوروں میں سے درمیانی عمر والے کو عوانٌ کہا جاتا ہے۔ بعض کے نزدیک جوان و طاقتور کو جس سے ایک دو بچے پیدا ہوں عوان کہتے ہیں۔

ذٰلِکَ اسم اشارہ مذکر آیا ہے، جبکہ لا فارض ولا بکر جو کہ بقرۃ کی صفت ہے، مؤنث ہے۔ اسی طرح ذٰلِکَ اسم اشارہ مفرد ہے، جبکہ مشارالیہ لا فارض ولا بکر دو ہیں۔ ان دونوں کا جواب یہ ہے کہ یہاں مشارالیہ ''المذکور'' ہے، جو کہ مفرد مذکر ہے۔ تقدیر عبارت ہے: بین ذلک المذکور

﴿فَافْعَلُوْا مَا تُؤْمَرُوْنَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سابقہ حکم الٰہی کی تاکید اور تجدید ہے۔ تشدد اور بے جا سوال پر ان کی تنبیہ ہے۔ یعنی اب تم اپنے رب کے حکم پر عمل کرو اور مزید سوالات سے گریز کرو۔

لیکن یہ قوم اپنی بری عادتوں سے باز آنے والی نہ تھی۔ پھر سوال کرنے لگے:

﴿قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّکَ یُبَیِّن لَّنَا مَا لَوْنُهَا قَالَ اِنَّهٗ یَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَۃٌ صَفْرَآءُ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِیْنَ﴾

صفراء، أصفر کی مؤنث ہے۔ فاقعٌ کو لونُها کا فاعل بنایا گیا، جبکہ معنوی لحاظ سے یہ صفراءُ کی صفت ہے۔ اس لیے صفراءُ فاقعةٌ کہنا تھا۔ فاقعٌ لونُها مجازی اسناد ہے؛ کیونکہ لون' صفراء کے متعلقات میں سے ہے۔ اور لون (رنگ) حَالٌّ یعنی حلول کرنے والی چیز ہے، بقرۃٌ اس کا مَحلّ ہے۔ حالٌّ اور محلٌّ کے درمیان گہرا تعلق ہوتا ہے۔ اس اسنادِ مجازی میں حکمت اور بلاغت یہ ہے کہ اس میں صفرۃ کی مزید تاکید اور شدت ہے۔

صفراء کی تفسیر میں سلف سے مختلف اقوال مروی ہیں: (۱) جمہور مفسرین کے نزدیک معروف زرد رنگ ہے۔ (۲) سینگ اور کھر بھی زرد رنگ کا ہونا چاہیے۔ (۳) صرف سینگ اور کھر زرد رنگ کے ہوں۔ (۴) کالا رنگ مراد ہے، اس قول کی دلیل یہ ہے کہ أصفر اونٹ کی صفت میں آیا ہے۔ کہا جاتا ہے: هٰذه إبلٌ صُفرٌ وهذه ناقةٌ صفراءُ اور اس سے سیاہ اونٹ مراد ہوتا ہے۔ اعشٰی شاعر کہتا ہے:

تلکَ خیلي وتلکَ رکابي　　　هنَّ صُفرٌ أولادُها کالزَّبیبِ

امام طبریؒ، قرطبیؒ وشوکانیؒ وغیرہ نے اس قول کو مرجوح قرار دیتے ہوئے مذکورہ شعر کا جواب دیا ہے کہ اونٹ میں صفرۃ سے مراد خالص سیاہ نہیں، بلکہ زردی مائل سیاہ ہے۔ اور یہ مجازی معنی صرف اونٹ کے بارے میں استعمال ہوتا ہے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے: ﴿كَأَنَّهُ جِمٰلَتٌ صُفْرٌ﴾ [المرسلات ۳۳] ☆ ''گویا کہ وہ (چنگاریاں) سیاہ اونٹ ہیں۔'' لیکن زیر تفسیر آیت مبارکہ میں صفراء سے مراد کالی نہیں؛ کیونکہ اس کی تاکید فاقعٌ لونها سے آئی ہے۔ اور فاقعٌ فُقُوْعٌ سے اسم فاعل ہے۔ تمام اہل لغت کا اتفاق ہے کہ فاقع اور اس کے مشتقات صرف زرد رنگ کی تاکید اور شدت کے اظہار کے لیے آتے ہیں۔ اور یہ لفظ عربی زبان میں کبھی اسود (کالا) کی تاکید کے لیے نہیں آیا ہے۔ بلکہ أسود کی تاکید کے لیے حالِكٌ، دجوجيٌّ، غِرْبِيْبٌ جس کی جمع غرابيبُ ہے، استعمال ہوا ہے۔ جس طرح أحمر کی تاکید قاني، أبيض کی تاکید ناصع ولهقٌ اور أخضر کی تاکید ناضر آتی ہے۔

اسی طرح صفراء کی صفت تسرُّ النّاظرينَ آئی ہے، اور پیلے رنگ میں سیاہ کی نسبت زیادہ خوبصورتی ہوتی ہے۔ اس لیے پہلا قول ہی راجح ہے۔

تَسُرُّ، سُرُوْرٌ سے مشتق ہے۔ سرور اصل میں اس لذت کو کہا جاتا ہے جو کسی نفع کے حصول یا نفع کی توقع کے وقت دل میں پیدا ہوتی ہے۔ یہ سِرٌّ سے ماخوذ ہے۔ یعنی باطنی اور اندرونی لذت کا نام سُرور ہے۔ یہ گائے اتنی صاف، اجلی اور گہرے زرد رنگت کی ہو، جو اس کی طرف دیکھنے والوں کو بھلی لگے اور انہیں خوب پسند آئے۔ وھب بن منبہؒ کہتے ہیں: ایسا لگے جیسا کہ سورج کی شعاعیں اور کرنیں اس کی کھال سے پھوٹ رہی ہیں۔

بنی اسرائیل کے اس دوسرے سوال سے جوان ہونے پر زائد ان پر تین پابندیاں عائد ہوئیں:

(۱) پیلی رنگت، (۲) زردی انتہائی صاف اور گہری ہو، (۳) دیکھنے والوں کو بھلی اور اچھی لگے۔

☆ اکثر مفسرین نے ''سیاہ اونٹ'' کہا ہے، بعض نے ''زرد'' کا بھی ذکر کیا ہے، شاہ رفیع الدینؒ اور نواب وحیدؒ وغیرہ نے ترجمہ ''زرد اونٹ'' کیا ہے۔ ابن عباس ﷺ سے منقول ہے: قِطَع النحاسِ (تانبے کے ٹکڑے)۔ بعض نے ''بڑے بڑے تنے'' کہا ہے۔ نحاس نے سفینوں کی رسیاں کہا ہے۔ امام ثعلبیؒ اور بغویؒ نے آگ کا رنگ کہا ہے۔ اور کالے رنگ کو قیل کے ساتھ ذکر کر کے ایک حدیث پیش کی ہے: ''إن شررَ نارِ جهنمَ أسودُ كالقيرِ'' لیکن یہ حدیث نہیں ملی۔ (ابو محمد)

گائے کے مذکورہ صفات وقیود میں محصور ہونے کے باوجود انہیں تسلی نہیں ہوئی؛ وہ مزید سوال داغنے لگے:

﴿قالوا ادعُ لنا ربّک یُبیّن لنا ما ھِیَ﴾ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے مزید ماہیت کے بارے میں پوچھنے لگے، اور اس سوال کا بہانہ یہ تراشا: ﴿إنّ البقرَ تشابَهَ علينا﴾ اس طرح کی گائے زیادہ دستیاب ہونے کی وجہ سے مطلوبہ گائے ہم پر مشتبہ ہو چکی ہے۔ یہ صرف ان کا اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول علیہ السلام کے حکم کو ٹالنے کا ایک اور بہانہ تھا۔ ورنہ عمر اور رنگ کی تعیین کے بعد کوئی اشتباہ نہ رہا تھا۔ یہاں **ما ھي** کے ساتھ دوبارہ سوال ہو رہا ہے، لیکن دونوں کا جواب مختلف ہے۔ پہلے **ما ھي** سے اس کی عمر کے بارے میں سوال ہوا تھا۔ اور دوسرے **ما ھي** سے اس میں کسی عیب کی گنجائش ہے کہ نہیں؟ کیا وہ کام کاج کرنے والی ہو یا نہ ہو؟

البقر لفظاً مذکر ہے اور یہ بَقَرَۃٌ کی جمع ہے۔ یہاں جنس بقر مراد ہے۔ اس کی لفظی تذکیر کا خیال رکھتے ہوئے تشابهَ باب تفاعل سے فعل ماضی مذکر آیا ہے۔ جو اصل میں تَتَشَابَهُ فعل مضارع مؤنث ہے۔ یہ اس کی اصل بقر (جمع) کے لحاظ سے ہے۔ البقر میں ایک قراءت الباقِر ہے، یہ بھی بقرة کی جمع ہے۔

﴿وَاِنَّآ اِنْ شَآءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ﴾ میں تین مؤکدات آئی ہیں: (۱) إنَّ حرف تحقیق وتأکید، (۲) لمهتدون میں لام تأکید، (۳) جملہ اسمیہ سے اس کی مزید تأکید کی گئی؛ کیونکہ اس میں جملہ فعلیہ سے زیادہ تأکید ومبالغہ ہوتا ہے۔

مُهْتَدٍ اهتداء باب افتعال سے اسم مفعول ہے؛ یعنی اگر اللہ نے چاہا تو مطلوبہ گائے کی پہچان میں ہمیں ضرور رہنمائی ملے گی۔ تیسرے سوال میں ان سے ایک خیر کا پہلو ظاہر ہو رہا ہے کہ جب ہمارا التباس ختم ہو جائے گا تو ہم ضرور حکم الٰہی کی تعمیل کر لیں گے۔ بعض اسلافؒ کہتے ہیں کہ اگر وہ اس دفعہ "إن شاء الله" نہ کہتے تو انہیں مطلوبہ بقرة کی مزید وضاحت بیان نہ کی جاتی (اور ان پر عذاب آتا)۔ اور یہ احتمال بھی ہے کہ انہوں نے مشیت الٰہی سے حجت لینے کے لیے إن شاء الله کہا ہو، اگر انہیں اپنے زعم کے مطابق وضاحت نہ کی جاتی تو وہ کہتے: اللہ نے نہیں چاہا تو اس کی پہچان نہ ہو سکی۔ اور یہ احتمال بنی اسرائیل جیسی قوم سے بعید نہیں۔

﴿لَا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ﴾ یہ بقرة کی صفت ہے۔ ذَلُولٌ، ذَلَّ يَذِلُّ سے مبالغے کا صیغہ ہے۔ یعنی لَمْ يُذَلِّلْهَا العَمَلُ (اس سے کام لے کر خستہ حال نہ کیا گیا ہو) اسے سواری، بوجھ ڈھونے، ہل جوتنے یا رہٹ چلانے کے لیے سدھایا نہ گیا ہو۔ ایسے کاموں کے لیے استعمال ہونے والے کو رَجُلٌ ذَلِيلٌ بَيِّنُ الذُّلِّ، دابَّةٌ ذَلُولٌ بَيِّنَةُ الذُّلِّ کہا

جاتا ہے۔تُثِيرُ الْاَرْضَ بھی بقرۃ کی صفت ہے اور اس کا تعلق لا ذلولٌ سے ہے۔یعنی: بقرةٌ لا ذلولٌ مُثِيرَةٌ (ہل جوتنے والی نہ ہو) اس لیے یہاں وقف کرنا درست ہے۔ ایک مرجوح تفسیر کے مطابق تثیرُ الأرضَ جملہ مستأنفہ ہے۔یعنی: ہل جوتنے والی ہو۔اگر جملہ مستأنفہ ہوتا تو اس کے بعد واو عاطفہ اور لا دونوں جمع نہ ہوتے۔وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ. اسی طرح اگر اس کے معنی ہل جوتنے والی ہوتے تو لا ذلولٌ کے منافی ہوتا۔أثارَ يُثِيرُ إثَارَةً زراعت کے لیے ہل چلانے کو کہا جاتا ہے۔ولا تَسْقِي الْحَرْثَ اور نہ کھیت کو سیراب کرتی ہو۔

﴿مُسَلَّمَةٌ لا شِيَةَ فِيْهَا﴾ مسلّمة بھی بقرةٌ کی صفت یا مبتدا محذوف کی خبر ہے۔اور باب تفعیل سے اسم مفعول ہے اور سلامۃ سے مأخوذ ہے۔جس کے معنی ہیں: محفوظ رکھی ہوئی، صحیح سلامت۔یعنی وہ لنگڑا پن، بھینگا پن وغیرہ جسمانی عیوب سے پاک ہو۔

﴿لا شِيَةَ﴾ میں لاء نفی جنس اور شیة اسم لا ہے۔شِيَة دراصل وَشْيٌ ہے، جیسے کہ زِنَة، عِدَة، صِلَة اصل میں وَزْنٌ، وَعدٌ، وَصْلٌ تھا۔واو کو حذف کر کے اس کے عوض آخر میں تا لایا گیا۔اور یہ اصل میں وشي الثوب سے مشتق ہے۔یعنی کپڑا دو مختلف رنگوں سے بن لینا۔اسی سے چغل خور کو واشٍ کہا جاتا ہے؛ کیونکہ وہ اصل بات کو بدل کر اپنی طرف سے مختلف رنگ میں پیش کرتا ہے۔آیت میں لا شية سے مراد کسی اور رنگ کی آمیزش نہ ہونا ہے۔

بنی اسرائیل اپنے غیر ضروری سوالات کی وجہ سے مشکل میں پھنس گئے۔یہاں تک کہ بعض مفسرین کے بقول مطلوبہ جانور وحشی تھا۔اسرائیلی روایات میں اس گائے کے بارے میں مختلف تفصیلات ہیں۔

بعض روایات میں ہے کہ جب موصوفہ گائے کی تلاش شروع ہوئی تو بالآخر ایک بڑھیا کے پاس مل گئی، جس کے ہاں یتیم بچے تھے۔اس عورت نے اس گائے کو دوگنی قیمت میں فروخت کر دیا۔بعض روایات میں ہے کہ یہ ایک شخص کے پاس تھی جو اپنے باپ کے ساتھ نہایت حسن سلوک کرنے والا تھا۔انہوں نے اس سے گائے کی کھال بھر کر سونا دے کر خریدی۔امام قرطبیؒ وغیرہ نے ایک اور روایت نقل کی ہے کہ بنی اسرائیل کے کسی بزرگ کے ہاں ایک بیٹا پیدا ہوا، جس کے پاس صرف ایک بچھڑا تھا۔اس نے اپنے بیٹے کی بلوغت تک کے لیے اللہ کے نام پر جنگل میں چھوڑا۔بزرگ کی وفات کے بعد ماں نے بیٹے کو گائے کے بارے میں بتایا، بیٹا جنگل سے پکڑ لایا۔بنی اسرائیل کی مطلوبہ تمام صفات اسی گائے میں تھیں، اس کی قیمت تین دینار تھی۔لیکن بڑھیا اور اس کے بیٹے نے زیادہ قیمت

مانگی۔انہوں نے اس کے وزن سے دس گنا دینار دے کر اور ایک روایت کے مطابق اس کی کھال بھر کر دینار دے کر خریدی۔ یہ روایات اسرائیلی ہیں، پھران میں کافی اختلاف اور نکارت بھی ہے۔اس لیے انہیں صرف معلومات کے لیے نقل کیا ہے؛ان پر اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔

﴿قالوا الآنَ جِئتَ بِالحقِّ﴾ الْآنَ اسم زمان ہے،جس سے وقت حاضر کی طرف اشارہ کیا جاتا ہے۔

جئتَ بِالحقِّ کے مفہوم میں مفسرین کی دو آراء ہیں:

(۱) قرآنی سیاق کی روشنی میں مراد یہ ہے کہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی اور عناد کے بل پر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہ رہے ہیں کہ جب ہم نے مقدمہ قتل کا فیصلہ طلب کیا تو آپ نے ہمیں گائے ذبح کرنے کا حکم دیا۔اس سے ہمیں محسوس ہوا کہ ہم سے مذاق کیا جا رہا ہے؛ کیونکہ قاتل کی نشاندہی اور گائے کے ذبح میں کیا مناسبت ہے؟! اب چونکہ آپ نے گائے کی ساری نشانیاں بتادی ہیں،تو ہمیں اندازہ ہو رہا ہے کہ یہ حکم برحق تھا۔

اگر یہ بدبخت شروع میں ہی اس حکم پر عمل پیرا ہوتے تو نہایت آسانی ہوتی۔کیونکہ وہ حکم اس وقت بھی برحق تھا۔بنی اسرائیل کی عاداتِ بد کی مناسبت سے شیخ ابن العثیمینؒ نے اسی مفہوم کو ترجیح دی ہے۔

(۲) بنی اسرائیل نے کہا کہ گائے کے بارے میں آپ نے پہلے جو علامتیں بیان کیں وہ ناکافی تھیں۔ اب آپ نے مکمل وضاحت کے ساتھ بتائی ہے۔اس تفسیر کو درست ماننے والوں کا کہنا ہے کہ بنی اسرائیل کی طرف یہ نسبت کرنا مشکل ہے کہ انہوں نے اپنے پیغمبر کی پہلی باتوں کو مبنی برحق تسلیم نہیں کیا تھا۔کیونکہ انہوں نے اسے ذبح کرلیا۔اس قول کے قائلین کہتے ہیں: پھر بھی ان کا اندازِ کلام ﴿الآنَ جئتَ بالحقِ﴾ انبیاء کرام سے خطاب کے آداب کے بالکل منافی ہے۔

اس رائے کو امام طبریؒ نے اختیار کیا ہے۔لیکن پہلی توجیہ سیاقِ قرآنی سے زیادہ موافقت رکھتی ہے۔

﴿فَذبحُوهَا وما كَادُوا يفعلونَ﴾ كادَ افعال مقاربہ میں سے ہے،جو کسی کام کو عنقریب سرانجام دینے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے۔ما حرف نفی ہے۔یعنی وہ گائے ذبح کرنے کے قریب ہی نہ تھے۔

اس کی وجہ کے بارے میں علمائے تفسیر سے مختلف آراء منقول ہیں: (۱) گائے کے مالک نے زیادہ قیمت مانگی۔حافظ ابن کثیر نے اسرائیلی روایت ہونے کے علاوہ روایتوں کے اختلاف کی وجہ سے اسے محل نظر قرار دیا۔

(۲) اس کے ذبح سے قاتل کی نشاندہی ہونے کا اندیشہ تھا، جس میں ان کی رسوائی تھی۔ امام طبریؒ نے ان دونوں وجوہات کو ذبح مشکل ہونے کا سبب قرار دیا ہے۔ (۳) بنی اسرائیل کے عناد اور تعمیل فرمان میں بلاوجہ تاخیر کی خاطر فضول قسم کے سوالات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اس حکم کو ٹالنا چاہتے تھے۔

﴿وَاِذ قتلتُم نفسًا فادّرء تم فیها﴾ قتل کو ان سے منسوب کیا، کیونکہ قتل ان کے درمیان واقع ہوا تھا۔ اور قاتل بھی انہی میں سے تھا۔ ادّارءُ تُم کی اصل تدارءُ تم ہے، تاکو د سے بدل کرد میں مدغم کیا اور شروع میں ہمزہ وصل لایا گیا۔ یہ اصل میں دَرْءٌ سے ماخوذ ہے، جو دفع کرنے، دھکا دینے اور پھینکنے کے معنوں میں آتا ہے۔ یعنی تم میں سے ہر ایک اپنی ذات سے قتل کی تہمت دور کر کے دوسروں پر ڈال رہا تھا۔ یہاں اس مقتول کے بارے میں ذکر نہیں ہے کہ وہ مرد تھا یا عورت تھی؛ لیکن بعد میں اضرِبُوْهُ میں ضمیر مذکر لا کر اشارہ کیا کہ مقتول مرد تھا۔

﴿وَاللّٰهُ مخرِجٌ مّا کنتُم تکتُمُونَ﴾ یہ جملہ معترضہ ہے۔ مربوط کلام یہ ہے: واِذ قتلتم نفسا فادّارء تم فیها فقلنا اضربوه ببعضها. راللّٰهُ مُخرِجٌ مبتدا خبر ہے۔ ما اسم موصول مفعول ہونے کی وجہ سے محلا منصوب ہے۔

تکتمون میں ضمیر عائد محذوف ہے: تکتمونه یعنی اللہ سبحانہ وتعالیٰ اپنی قدرتِ کاملہ سے ان تمام چیزوں کو نکالنے والا ہے جنہیں تم چھپاتے ہو۔

انہی مخفی امور میں سے ایک مذکورہ قصے میں قاتل کا مسئلہ بھی ہے، جس کے بارے میں وہ جھگڑ رہے تھے۔ قاتل اپنے سنگین جرم کا الزام دوسرے لوگوں پر لگا رہا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنی عظیم قدرت سے اسے ظاہر فرما دیا۔

﴿فقلنا اضربوه ببعضها﴾ قائل اللہ تعالیٰ ہے، یعنی ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہلوایا۔ حقیقت میں حکم فرمانے والے کی طرف نسبت کی۔ یہ بھی کلام عرب میں رائج ہے، جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے: ﴿اِنَّ عَلَینَا جَمعَهٗ وَقُراٰنَهٗ ○ فَاِذَا قَرَاْنٰهُ فَاتَّبِع قُراٰنَهٗ ○﴾ یہاں قراناه یعنی قَرَأهُ جبرِیلُ (جبریل علیہ السلام نے پڑھا۔)

﴿بِبَعضِها﴾ سیاقِ آیت کی دلالت کی وجہ سے جواب امر کو حذف کر دیا: فضربُوهُ فَحيِيَ پس ہم نے فرمایا اس مقتول کو گائے کا ایک ٹکڑا مارو، انہوں نے مارا تو وہ زندہ ہو گیا، (پھر اس نے اپنے قاتل کے بارے میں بتا دیا۔) تفسیری روایات میں مختلف اقوال منقول ہیں کہ گائے کا کون سا حصہ مارا گیا؟ گائے کی زبان، ریڑھ کی ہڈی، کوئی بھی ہڈی، دونوں کندھوں کے درمیان کا گوشت، ران، کوئی بھی عضو۔ ان روایات میں سے کوئی بھی صحیح مرفوع نہیں